(غلام گردش)

سائیکل ریس

چند دن پہلے، قومی اخبارات میں مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی۔ پشاور میں خواتین کی سائیکل ریس کو صرف اس وجہ سے منسوخ کر دیا گیا کہ مذہبی جماعتوں نے اعلان کیا تھا کہ اس ریس کی بھرپور مخالفت کرینگے۔ ہر طریقے اور زاویہ سے بے حیائی کے اس نمونہ کو کامیاب نہیں ہونے دینگے۔ یہ دوڑ ایک مقامی این جی او کروا رہی تھی۔ لازم ہے کہ پشاور کی انتظامیہ کے تعاون بلکہ سرپرستی سے ہی طے ہوا ہوگا۔ مگر سب کچھ ختم کیوں ہوا۔ صرف اسلیے کہ مذہبی سیاسی جماعتیں اس تمام کو اچھا نہیں گردانتیں۔ انکے مطابق یہ معاملہ ہمارے دین کے اعلیٰ اُصولوں کے خلاف ہے۔ جہاں دین کا نام آجائے، وہاں اسکی توجیح اور تفصیل طے کرنے کا واحد اختیار چند ایسے علماء کو حاصل ہو جاتا ہے جن سے آپ کوئی بحث نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپکو اس قدامت پسند معاشرے میں بہرحال زندہ رہنا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں کیا آپ انسانی فکر اور عمل کو کسی بھی طریقے سے دبا سکتے ہیں۔ کیا خواتین کو صرف مذہبی تاویل کے تحت مردوں کے برابر کے حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ سوال ملک میں ہر ایک سوچنے والے کے ذہن میں موجود ہے۔ مگر اسکو جرات کے ساتھ، تمام فریقین کے سامنے اُٹھانا اَز حد مشکل سے مشکل تر ہو چکا ہے۔ وجہ صرف اور صرف گزشتہ چالیس برس میں ریاستی سطح پر مخصوص مذہبی فکر کو پروان چڑھا کر لوگوں کو آزاد سوچ سے محروم کرنا ہے۔

چلیے۔ مان لیا، کہ پشاور میں ہونے والی خواتین کی سائیکل ریس دباؤ میں آکر منسوخ کر دی گئی۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا پاکستان کے بڑے شہروں میں چالیس برس پہلے لڑکیاں اور خواتین آنے جانے کیلیئے سائیکل کا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ شائد چھوٹی عمر کے مرد اور خواتین کو یقین نہ آئے، کہ لاہور، کراچی، پشاور اور دیگر بڑے شہروں میں لڑکیاں سڑکوں پر عام سائیکل چلاتی نظر آتی تھیں۔ کوئٹہ کا ذکر کرنا بھول گیا۔ مجھے بہت سے لوگوں نے بتایا کہ کوئٹہ شہر کی سڑکوں پر بچیاں سکول اور کالج آنے جانے کیلیئے سائیکل کا عام استعمال کرتی تھیں۔ فیصل آباد میں متعدد بار لڑکیوں کو سائیکل چلاتے دیکھا ہے۔ ڈویژنل پبلک سکول کی اندرونی سڑکوں پر ہزاروں بار خواتین سائیکل چلاتی نظر آتی تھیں۔ یہ نہ کوئی معیوب بات سمجھی جاتی تھی، نہ ہی اسے کسی قسم کی مذہبی سند کی ضرورت تھی۔ یہ زندگی میں ایک عمومی رویہ تھا جسے کوئی برا نہیں سمجھتا تھا۔ مگر گزشتہ چالیس برس میں ہم نے حکومتی سطح پر دہشت گردی کی سرپرستی کی ہے۔ یہ ایک قومی جرم تھا مگر اسے ماضی کے مقتدر طبقے نے عالمی طاقتوں کے ہاتھوں میں استعمال ہو کر دھڑلے سے سرانجام دیا۔ روس کو شکست دیتے دیتے ہم نے اپنا تہذیب یافتہ معاشرہ برباد کر لیا۔ مجموعی طور پر ہر آزاد سوچ کو ختم کر ڈالا۔ جس مرد اور عورت نے معمولی سا بھی انحراف کیا، اسے خاموش کروا دیا گیا۔ یا وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ مذہبی شدت پسندی کو معاشرے میں شامل کرنے کے قومی جرم کو آج تک باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسے ختم کرنے کیلیئے کوئی فکری، علمی یا سماجی جدوجہد نہیں کی گئی۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ قدامت پسند فکر، روپ بدل بدل کر ہمارے سامنے عفریب بنکر آجاتی ہے۔ گزشتہ چھ برس سے ہمارے عسکری ادارے دہشت گردی کے خلاف لڑ رہے ہیں مگر ابھی تک اس جن پر مکمل طور پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ قابل قدر قربانیوں کے باوجود بھی مذہبی بنیاد پر اسطوار دہشت گردی کا مکمل قلع قمع نہیں

کیا جاسکا۔کئی افسران جنکا تعلق کے پی کے قبائلی علاقوں سے ہے۔اس جنگ کے متعلق نا قابل یقین حقائق سامنے رکھتے ہیں۔انکے بقول عسکری ادارے،اس جنگ کو کم تو کر سکتے ہیں مگر مکمل طور پر جیت نہیں سکتے۔اسکی وجہ وہ مضبوط تشدد پسندانہ سوچ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوئی ہے۔جو صرف اور صرف خود ساختہ طرز کے دین کو سب پر نافذ کرنا چاہتی ہے۔اس فکر کا مقابلہ کرنے کیلیئے ہمارے پورے معاشرے میں کسی قسم کی کوئی متبادل سوچ موجود نہیں ہے۔اس خلا کا سب سے زیادہ فائدہ دینی مذہبی جماعتیں اُٹھاتی ہیں۔وہ عسکری اداروں کی بھرپور جدوجہد کو ایک دم مٹا کر رکھ دیتی ہیں۔سوچ کو اتنا محکوم بنا دیتی ہیں،کہ عام لوگ انہی کی طرح سوچ کر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ایک معتدل مزاج مذہب کی تشریح کو تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔

دس بارہ برس پہلے لاہور میں خواتین کی ایک دوڑ کا اہتمام کیا گیا تھا۔اسے ناکام بنانے کیلیئے بھی مذہبی جماعتیں خم ٹھوک کر سامنے آ گئی تھیں۔اچھی طرح یاد ہے کہ فاروق حیدر مودودی،مرحومہ عاصمہ جہانگیر اور دیگر علماء نے اس دوڑ کے حق میں جلوس نکالا تھا۔اچھی طرح یاد نہیں کہ ان بہادر افراد نے ریس میں حصہ بھی لیا تھا کہ نہیں۔دوڑ کامیاب ہو پائی کہ نہیں،یقین سے کچھ عرض نہیں کر سکتا۔بہرحال جتنا شور وغوغہ اس دوڑ کے خلاف ہوا تھا،اس طرز پر اسکے حق میں بھی آواز بلند ہوئی تھی۔جو ہری بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اکثریت طبقہ موجود ہے جو خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی سماجی طور پر زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔مگر ایک طاقتور اقلیت موجود ہے جو بہرحال اپنے افکار کو دین کا غلاف پہنا کر ریاست پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔مقصد صرف اور صرف ذاتی خیالات کو جبر کے ذریعے نافذ العمل کرنا ہے۔سوال یہ ہے کہ مقامی شدت پسند طبقہ،دوبئ،قطر،ترکی،موروکو،تیونیسا اور ملائشیا کی طرف کیوں نہیں دیکھتا۔جہاں ہر شخص اپنے مذہبی افکار کے ساتھ بڑے آرام سے زندگی گزار رہا ہے۔تین ماہ پہلے ترکی جانے کا اتفاق ہوا۔خواتین نے حجاب بھی لے رکھا تھا۔اسکے برعکس کچھ خواتین سکرٹ زیب تن کیے بڑے آرام سے آ جا رہی تھیں۔مغربی لباس اور سماجی ترقی کا ایک امتزاج ہے جو بہرحال ہمارے ملک سے کافی بہتر ہے۔وہاں لوگ نماز بھی پڑھ رہے تھے اور بغیر کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر زندگی کو سکون سے گزار بھی رہے تھے۔کوئی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا تک نہیں تھا۔موروکو اور تیونسیا کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔دوبئ بھی ایک ایسا شہر ہے جہاں مغربی زندگی اور مذہبی رواداری عام نظر آتی ہے۔

ہر چیز چھوڑ دیجیئے۔افغانستان کی مثال سامنے رکھیے۔آج کہیں بھی اس بدقسمت ملک کا ذکر کریں۔جنگ،بم دھماکے،قتل وغارت اور بدحالی کی تصویر سامنے آ جائیگی۔مگر 1977 سے قبل افغانستان ایک انتہائی مہذب اور لبرل معاشرے کی تصویر تھا۔اچھی طرح یاد ہے کہ فیصل آباد سے لوگ گاڑیوں اور بسوں پر صرف سیر کیلیئے کابل جایا کرتے تھے۔دنیا کی تمام نئ فلمیں کابل میں اسی طرح ریلیز ہوتی تھیں جیسے نیویارک،لندن اور دیگر شہروں میں۔سینکڑوں چائے خانے،کیفے،بارز موجود تھے اور یہ مکمل طور پر پُرسکون شہر تھا۔ہزاروں کی تعداد میں مغربی سیاح افغانستان کے گلی کوچوں میں موجود رہتے تھے۔وہاں سے پاکستان آتے تھے۔آپکو بالکل یقین نہیں آئیگا۔لاہور شہر کا انٹرنیشنل ہوٹل مغربی سیاحوں کی بھرپور آماجگاہ تھی۔مال روڈ پر اَن گنت مرد اور خواتین سیاح چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔بڑی بڑی بسوں میں مغربی سیاحوں کے کارواں لاہور اور دیگر بڑے شہروں میں پڑاؤ ڈالتے تھے۔آسودہ حال گورے

اور گوریاں، انٹرکونٹینینٹل ہوٹل میں قیام پذیر رہتے تھے۔ کراچی میں بھی یہی عالم تھا۔ دنیا کی تمام ائیرلائنز کراچی کو اپنا گڑھ گردانتی تھیں۔ کلبز اور جدید ہوٹلوں کا ایک جال تھا جو ہر طرف شائستگی کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ کوئی پاکستانی دوسروں کو مذہبی عقائد کی بنیاد پر تنگ نہیں کرتا تھا۔ ریاستی جبر بھی موجود نہیں تھا۔ مگر آج سب کچھ زیرِ زمین چلا گیا ہے۔ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر چھپ کے، ڈر کے۔ ہم نے گزشتہ چالیس برسوں میں معاشرتی رویوں پر منافقت کی ایسی چادر چڑھا دی ہے جسکو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کئی مغربی سفارتکاروں نے بتایا کہ جتنا "مشروب صحت" اسلام آباد، لاہور، کراچی اور پاکستان کے شہروں میں پوشیدہ طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے، وہ مغربی ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک سفارت کار نے یہاں تک کہا کہ جتنی شراب اس نے پاکستان میں دیکھی ہے، اتنی اپنے ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ مگر ہر چیز چھپ کر ہو رہی ہے۔ چار دیواری کے تقدس کے عین درمیان میں رواں ہے۔ یہ منافقت ہمیں لیکر بیٹھ گئی ہے۔ کیونکہ ظاہراً کوئی بھی اعتراف نہیں کرتا کہ اسکی شام کی مصروفیات کیا ہیں۔ کیسی ہیں۔ اس سے زیادہ میں کیا لکھوں، کیا عرض کروں۔ مجھے بھی یہاں اس ملک میں رہنا ہے۔

ہماری سیاسی جماعتیں حد درجہ نحیف ہیں۔ ہمارے سیاسی اکابرین اس قدر کمزور ہیں کہ اعلانیہ طور پر سماجی رویوں کو قطعاً زیرِ بحث نہیں لاتے۔ ذکر کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں کہ کہیں لوگ انہیں اعتدال پسند طبقے سے منسلک نہ کرلیں۔ ہر شخص اپنے آپکو اچھا، بہتر اور فرشتہ سیرت ثابت کرنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ مسجدیں بھری ہوئی ہیں۔ لوگوں نے لمبی لمبی داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پیشانیوں پر محرابوں کی بھرمار ہے۔ مگر اسلام جیسے انقلابی مذہب کی عملی تصویر کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ کسی بھی دینی اُصول کے زاویہ سے عملی زندگی کو پرکھیے۔ دوعملی، منافقت اور غلیظ رویے دیکھ کر حیران ہو جائینگے۔ کاروباری طبقہ لوٹ مار کو جائز سمجھتا ہے۔ سرکاری ملازم دھڑلے سے رشوت وصول کرتا ہے۔ ہر جانب کوڑے کرکٹ کے انبار نظر آتے ہیں۔ ایک انچ بھی ایسا نہیں ہے جسکے متعلق کہا جا سکے کہ یہاں تمام لوگ اپنے مذہبی عقائد کو عملی شکل دے رہے ہیں۔

اس تمام صورتحال میں نوجوان نسل سب سے زیادہ پریشان ہے۔ آگاہی کے جدید انقلاب نے انہیں ہر چیز سے روشناس کر دیا ہے۔ ہر نوجوان بچے اور بچی کے ہاتھ میں موبائل فون نے جدید دنیا سے منسلک رہنے کا ایک بھرپور جواز فراہم کر دیا ہے۔ جدید نسل سمجھ ہی نہیں پاتی، کہ ہمارے ملک میں دلہری زندگی گزارنا ہی اصل شعار ہے۔ جھوٹ، فریب، دھوکہ بازی، وعدہ خلافی اور ظلم کرنا ہماری پہچان ہے۔ ہم خواتین کی ایک سائیکل ریس کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مگر زندگی کی اصل دوڑ میں منافقت اور جہالت کی سائیکل کو کسی قیمت پر نہیں روک سکتے۔ ان عجیب وغریب رویوں کے ساتھ ترقی کرنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

راؤ منظر حیات